دعوت کے نشانِ راہ

خُرّم مُرادؒ

منشورات

00062 / 13

جملہ حقوق محفوظ

دعوت کے نشانِ راہ　　از　　خرم مرادؒ
جنوری ۱۹۹۸ء _ تعداد: ۲۰۰۰ _ کوڈ: 00062 _ **قیمت**: ۱۳روپے
ناشر: **منشُورات**، منصورہ، لاہور۔ ۵۴۷۹۰ _ مطبع: جے کیو پریس، بندروڈ، لاہور۔
فون: 35252211 _ فیکس: 042-35252210 _ ای میل: manshurat@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالضُّحٰیo ۙ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰیo ۙ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰیo ؕ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ
لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰیo ؕ وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰیo ؕ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰیo ۪
وَوَجَدَکَ ضَآ لًّا فَہَدٰیo ۪ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰیo ؕ فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡہَرۡo ؕ
وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡہَرۡo ؕ وَاَمَّا بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡo ؑ (الضحٰی ۹۳:۱-۱۱)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے۔ (اے نبی ﷺ) تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔ اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے، اور عن قریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمھیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمھیں نادار پایا اور پھر مال دار کر دیا۔ لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو، اور سائل کو نہ جھڑکو، اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔

باسمہ

سورۂ ضحیٰ ۱۱ آیات پر مشتمل ہے۔ پہلی دو آیات میں دن اور رات کی قسم کھائی گئی ہے۔ اگلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے محبت اور شفقت کے ساتھ وعدے فرمائے ہیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ کی ذات مبارک پر اللہ تعالیٰ کے جو احسانات رہے ہیں، ان کا تذکرہ کیا گیا ہے آپ ﷺ یتیم تھے، اللہ نے آپ ﷺ کی پرورش فرمائی۔ آپ ﷺ کو راہ کی تلاش تھی، اللہ نے آپ ﷺ کو راہ دکھائی۔ آپ ﷺ نادار تھے، اللہ نے آپ ﷺ کو غنی کر دیا وغیرہ۔ آخری تین آیات میں ہدایت کی گئی ہے کہ یتیم کا حق نہ مارنا، اس کو نہ جھڑکنا اور نہ دبانا۔ سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹانا اور نہ اس کو جھڑکنا۔ آخر میں فرمایا گیا کہ تمھارے رب نے تم پر جو نعمت فرمائی ہے، اس کو بیان کرتے رہنا۔ یہ پوری سورہ اللہ اور اس کے محبوب بندے محمد ﷺ کے درمیان گفتگو پر مبنی ہے۔

قرآنی سورتوں کے باہمی ربط کے حوالے سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر سورہ پچھلی سورہ سے مربوط ہے، آنے والی سورہ سے بھی اور گذشتہ سورہ سے بھی، تو اچانک یہ حضور ﷺ سے خطاب کیوں شروع ہو گیا؟ نیز کیا اس میں عام مسلمانوں کے لیے بھی کوئی رہنمائی ہے؟ اس حوالے سے گذشتہ سورتوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ سورۂ شمس پر اگر غور کیا جائے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت، طبیعت اور مزاج میں ہدایت کا

سامان لیے ہوئے ہے۔ نیکی بدی اور اچھائی برائی کی پہچان اسے ودیعت کی گئی ہے۔ وہ اپنی ذات اور زندگی کے لیے ذمہ دار بنایا گیا ہے اور اسے انتخاب و اختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ اس اختیار کو استعمال کر کے اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرے گا تو کامیاب ہوگا۔ جیسا کہ قرآن نے کہا: قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰیۙ (الاعلیٰ ۸۷:۱۴) ''فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی''۔ اس کے مقابلے میں اگر اس نے اپنے نفس کو برائیوں کے نیچے دبا دیا تو وہ نامراد ہوگا اور نقصان میں رہے گا۔

اس کے بعد سورۂ لیل ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کی کوششیں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں، اخلاقی طور پر بھی، اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی۔ اس بنیاد پر اللہ نے اعمال کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اعمال کی ایک قسم وہ ہے جس سے نیکی یا جنت کی راہ آسان ہوتی ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جس کے نتیجے میں انسان برائی یا جہنّم کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ آخرت میں بھی ان دونوں گروہوں کا انجام مختلف ہوگا۔ ایک کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور دوسرے کے لیے اللہ کی طرف سے ہدیہ، تحفہ اور عنایات ہیں جن کو پا کر وہ خوش ہو جائے گا۔

سورۂ لیل میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡهُدٰیۖ (اللیل ۹۲:۱۲) ''بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمے ہے''۔ گویا اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ راستہ ہم نے تمھاری فطرت اور طبیعت میں نیکی کی پہچان رکھ کر بھی بتایا ہے اور یہ راستہ ہم نے رات اور دن، سورج اور چاند، آسمان سے برسنے والی بارش اور زمین سے اگنے والی کھیتی سے بھی سمجھایا ہے۔ ان سب میں تمھارے لیے ہمارے راستے کی نشانیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے انبیا علیہم السلام بھیجے جنھوں نے اس بات کی تعلیم دی کہ اللہ کی بندگی کیسے کی جائے، اس کے احکام کیا ہیں جن کی پابندی کرنا چاہیے، نیز زندگی کیسے گزاری جائے؟ ان انبیا علیہم السلام میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے

آخری نبی اور ہادی ہیں۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو سورۂ ضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو مخاطب فرما کر ہدایت فرمائی ہے کہ جو فریضہ، ذمہ داری اور کام اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سپرد کیا ہے، اسے کیسے انجام دیا جائے، لوگوں تک ہدایت کیسے پہنچائی جائے اور کیا طریقۂ کار اپنایا جائے؟، نیز اس سلسلے میں آپ ﷺ کی روش اور کردار کیا ہونا چاہیے؟ اس طرح سورۂ ضحیٰ کا گذشتہ سورتوں کے ساتھ ایک ربط اور تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ پوری سورہ اللہ کے نبی ﷺ سے خطاب پر مبنی ہے تو اس میں ہمارے لیے کیا ہدایت و رہنمائی ہے؟ اگر غور کیا جائے تو اس کے اصل مخاطب مسلمان ہیں۔ نبی آخرالزماں ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے جو بات بھی آپ ﷺ سے کہی جا رہی ہے، دراصل اس کے مخاطب ہم ہیں۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی ﷺ ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا ہے۔

ختم الرسل حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد انسانوں تک ہدایت پہنچانے کی ذمہ داری اللہ نے اس طرح پوری کی: **وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا**ؕ (البقرۃ ۲:۱۴۳) ''اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو''۔ گویا ہم نے تم کو امتِ وسط اس لیے بنایا ہے کہ جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے تم تک دین پہنچایا، اسے پیش کیا اور اس کی گواہی دی، اسی طرح تمام انسانوں تک ہر قوم، ہر نسل اور ہر جگہ تا قیامت دین پہنچانے کی ذمہ داری اب تمھاری ہے۔ اس لحاظ سے اس سورہ کے اصل مخاطب مسلمان ہیں۔ اب یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نبی آخرالزماں ﷺ کے جانشین ہونے کے ناطے،

قرآن کے پیغام کو عام کریں اور عامۃ الناس تک کما حقہ ہدایت پہنچانے کی ذمہ داری پوری کریں۔اس سورہ میں فریضۂ اقامت دین کی ادایگی کے لیے ہدایات ورہنمائی دی گئی ہے۔

اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ہمارے لیے محبوب ترین ذات ، آپ ﷺ کی ذات ہے۔اس لیے کہ ہمیں جو کچھ آپ ﷺ سے ملا، وہ کہیں اور سے نہیں ملا۔بلاشبہہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہمیں میسر ہیں مگر وہ چیز جس سے ہماری زندگی صحیح راہ پر لگ سکتی ہے، جس سے ہمارے لیے جنت کی راہ آسان ہوسکتی ہے، جس سے ہماری چند گھنٹوں یا چند برسوں پر محیط عارضی زندگی ابدی آرام وراحت میں بدل سکتی ہے، وہ نسخہ صرف آپ ﷺ ہی نے ہمیں بتایا، اور محض بتایا ہی نہیں بلکہ اس پر عمل کرکے بھی دکھایا۔ ورنہ ہم سب اندھیروں میں بھٹک رہے ہوتے اور گمراہی میں اپنی زندگی گزار رہے ہوتے ۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بار بار فرمایا کی اپنی جان، مال اور اولاد بلکہ اپنے آپ سے بڑھ کر مجھ سے محبت کرو۔حلاوت ایمان یا ایمان کی مٹھاس کی نشانی یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہمیں ان سب چیزوں سے بڑھ کر پیارے اور محبوب ہوجائیں۔ جہاں اللہ کے پیارے اور محبوب کا ذکر ہو، وہ چیز تو ویسے ہی ہمارے لیے بہت اہم اور قیمتی چیز ہے۔

سورۂ ضحیٰ میں بنیادی طور پر دو قسم کی چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مختلف مثالوں سے اس کو واضح کیا گیا ہے۔

وَالضُّحٰیۙ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰیۙ (الضحیٰ ۹۳: ۱-۲)

قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی' جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہوجائے۔

سورہ کا آغاز روزِ روشن اور رات کی قسم کھا کر ہو رہا ہے۔ وَالضُّحٰی کے معنی دن کا وہ خاص وقت ہے جب کہ سورج چڑھ چکا ہو مگر زوال کو نہ پہنچا ہو۔بعض لوگوں نے اس سے پورے دن

کا مفہُوم مراد لیا ہے، یعنی روزِ روشن؛ جب کہ بعض نے اس سے مراد دن کی روشنی لی ہے۔ یہاں مقصود یہ بحث نہیں ہے کہ اس کا اصل مفہُوم کیا ہے بلکہ یہ ہے کہ یہ قسم کیوں کھائی گئی۔

عام طور پر آدمی قسم اس چیز کی کھاتا ہے جو اس سے زیادہ برتر، طاقت ور یا موثر ہو۔ ہم اللہ کی قسم اس لیے کھاتے ہیں کہ اللہ ہم سے اعلیٰ و برتر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی قسم کیوں کھائی جو کہ کسی صورت میں اس سے برتر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قسم کھانے کا ایک مقصد کسی چیز کی سچّائی پر گواہی دینا بھی ہوتا ہے۔ گواہ ہمیشہ قسم کھا کر گواہی دیتا ہے۔ اللہ کی قسم کوئی شخص اس لیے کھاتا ہے کہ وہ اس چیز کی سچّائی پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جو حقائق ہمارے سامنے رکھ رہا ہے، ان کی حقانیت اور سچّائی پر وہ ان چیزوں کو بطورِ گواہ پیش کرتا ہے جن کی وہ قسم کھاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر اسی اصول کے تحت اس قسم کی قسمیں اٹھائی ہیں، مثلاً سورۂ تین اور سورۂ عصر میں انجیر اور زمانے کی قسم وغیرہ۔

سورۂ ضحیٰ میں دن اور رات کی قسم بھی اس لیے کھائی گئی کہ یہ ان باتوں کی سچّائی اور حقانیت پر گواہ ہیں جن کا ذکر اس سورہ میں کیا جا رہا ہے۔

اس سورہ میں قسم اٹھانے کے ضمن میں مفسرین نے بہت سے علمی سوالات اٹھائے ہیں، مثلاً اس سے پہلی سورہ میں پہلے رات کی قسم کھائی گئی اور پھر دن کی۔ لیکن یہاں پہلے دن کی قسم کھائی گئی اور پھر رات کی۔ اس کی کیا حکمت ہے؟ اس حوالے سے مفسرین نے تفصیلی بحث کی ہے لیکن اصل بات جاننے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا فرما رہا ہے، کیا ہدایت دے رہا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ بات جاننے کے لیے اس علمی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ذریعے ہم سے براہ راست مخاطب ہے۔

اگر ہم نکتہ آفرینی یا علمی بحث میں الجھ کر رہ جائیں تو پھر ہدایت کا پہلو متاثر ہو جاتا ہے جو قرآن کا اصل منشا ہے۔ اس لیے یہاں ان تمام سوالات کے تذکرے کی ضرورت نہیں جو انسان اپنی ذہنی تسکین اور علمی بحث کے لیے اٹھاتا ہے، اور جن کا ذکر تفسیروں میں موجود ہے۔ البتہ یہ بنیادی سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے یہاں دن اور رات کی قسم کس وجہ سے کھائی ہے؟ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی قسم کھائی گئی ہے وہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اس بنیادی بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں قسم اٹھائی گئی ہے۔ کہیں عبارت سے متعلّق قسم کھائی جاتی ہے، مثلاً سورۂ لیل میں اس انداز میں قسم کھائی گئی ہے، وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىۙ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰىۙ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓىۙ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰىؕ (۹۲:۱-۴) ’’قسم ہے رات کی‘ جب کہ وہ چھا جائے، اور دن کی‘ جب کہ وہ روشن ہو، اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں‘‘ یعنی تمھاری کوششیں اسی طرح مختلف ہیں جس طرح رات اور دن یا نر اور مادہ مختلف ہیں۔ کسی جگہ قسم کھانے کا تذکرہ متعدد آیات کے بعد کیا جاتا ہے۔ کسی جگہ پوری سورہ ایک مضمون پر مشتمل ہوتی ہے جس پر قسم شہادت کا ثبوت فراہم کرتی ہے، مثلاً سورۂ قیامہ میں ان الفاظ میں قسم کھائی گئی: لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِؕ (۷۵:۱-۲) ’’نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نہیں‘ میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی‘‘۔ پوری سورہ میں قیامت کا تذکرہ ہے جس کی حقانیت اور سچّائی کو ثابت کرنے کے لیے یہ قسم اٹھائی گئی ہے۔ ان تمام مقامات پر اللہ تعالیٰ اپنی بات کی سچّائی کو ثابت کرنے کے لیے بطور گواہی اور شہادت یہ مختلف قسمیں اٹھاتے ہیں نہ کہ ان کی عظمت کی بنا پر۔

سورۂ ضحیٰ میں، دن اور رات کی قسم سورہ کے مضمون سے متعلّق ہونے کی بنا پر کھائی گئی ہے۔ دن اور

رات کی گواہی دے کر اللہ تعالیٰ اپنے محبُوب بندے کو یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ جس طرح دن اور رات میں تغیّر و تبدل ہوتا ہے، اسی طرح حالات میں بھی تبدیلی آنا فطری امر ہے۔ راہِ حق میں مشکلات پیش آ رہی ہیں، لوگ بات سننے کے روادار نہیں بلکہ رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں تو یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ حق بہرحال غالب آ کر رہے گا۔ اللہ کی مدد تمھارے شامل حال ہے۔ اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ آپ ﷺ حق کی دعوت دیتے چلے جایئے۔ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کے ساتھ ہے۔ وہ ناراض نہیں ہوا۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰىؕ (۹۳:۳)

(اے نبی ﷺ) تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔

اس آیت کے حوالے سے تفاسیر میں عموماً یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے بعد نزولِ وحی میں کچھ وقفہ آ گیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلی وحی کے بعد نہیں بلکہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یہ وقفہ آیا تھا۔ اس وقفے کی مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ مدت ۱۱ دن تھی۔ بعض کے خیال میں ۱۵ یا ۴۰ دن تھی۔ اس مدت کے دوران حضور ﷺ بہت پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ حضور ﷺ اپنے آقا کے جس کام کی انجام دہی کے لیے کھڑے ہوئے تھے، اس کام کا بنیادی سہارا اور دل کے اطمینان و تسلی کا تمام تر انحصار اس گفتگو پر تھا جو آپ ﷺ کی اپنے محبُوب رب سے ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جب یہ سلسلہ رک گیا تو آپ ﷺ کو پریشانی ہوئی کہ کہیں میرا اللہ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گیا؟ کہیں مجھ سے کوئی غلطی یا قصور تو سرزد نہیں ہو گیا؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل فرمائی اور فرمایا کہ نہیں، تمھارے رب نے نہ تمھیں چھوڑا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔ یہ اس سورہ کی شانِ نزول ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر ہمیں یہ بات نہ بھی معلوم ہو کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب ایک عرصے تک نبی کریم ﷺ پر وحی کا نزول نہ ہوا تھا، تب بھی قرآن کے پیغام کو سمجھنے، اس سے ہدایت حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے میں ہمیں کوئی رکاوٹ یا مشکل پیش نہیں آئے گی۔

قرآن کی مختلف سورتوں کی شانِ نزول کے بارے میں، مختلف مفسرین اور علما نے جن میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ اللہ جیسے جید علما شامل ہیں، یہ لکھا ہے کہ جب کوئی واقعہ کسی آیت کی شانِ نزول میں بیان کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس آیت کے مفہوم کا اطلاق اس واقعے پر بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ آیات تو مکہ میں اترتی ہیں مگر واقعہ مدینہ میں پیش آتا ہے۔

قرآن کی شانِ نزول کے بارے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے بڑے قیمتی اور انقلابی ہیں کہ قرآن مجید کی شانِ نزول صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو راہِ ہدایت دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے باطل عقاید و نظریات اور افکار کی تردید کرنا چاہتا ہے اور اسے حق کی راہ پر چلانا چاہتا ہے۔ صرف اہلِ مکہ و مدینہ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں، ہر قوم کو راہِ حق دکھانا چاہتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی شانِ نزول، انسان کے گمراہ و باطل نظریات کی تردید اور اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کی ذمہ داری کی ادایگی کا نام ہے۔ فی الحقیقت یہی قرآن کی شانِ نزول ہے۔

لہٰذا قرآن میں اس قسم کے جتنے بھی واقعات آتے ہیں، وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ ایک مخصوص واقعہ ہے جس پر اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ یقیناً نزولِ وحی میں وقفہ آنے پر حضور ﷺ

کے رنج وغم اور پریشانی میں اضافہ ہوا ہوگا، اس پر بھی اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے۔

فی الواقع اصل بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں دعوت کا جو کام کر رہے تھے، قرآن کے جس پیغام کو عام کر رہے تھے، اس راہ میں آپ ﷺ کو سخت مصائب، مخالفتوں اور مشکلات کا سامنا تھا۔ لوگ آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے تھے، بات سننے کو تیار نہ تھے۔ کوہِ صفا پر چڑھ کر آپ ﷺ نے پوری قوم کو پکارا۔ لوگ آئے مگر مذاق اڑا کر چلے گئے۔ گھر میں اپنے قبیلے، رشتے داروں اور حقیقی چچا وغیرہ کی دعوت کی مگر انھوں نے بھی بات نہ سنی' الٹا مذاق اڑایا۔ لوگ تمسخر اڑاتے تھے، پتھر پھینکتے تھے اور راہ میں کانٹے بچھاتے تھے۔ اسی قسم کی بہت سی مشکلات و پریشانیوں کا آپ ﷺ کو سامنا تھا۔ ان حالات میں جو آدمی یہ سمجھتا ہو کہ وہ اس رب کائنات کا نمایندہ، سفیر اور پیغام بر ہے جس کے اختیارات ہر چیز پر حاوی ہیں مگر وہ بے یار و مددگار نظر آتا ہو، ہر ایک اس کی مخالفت پر تلا بیٹھا ہو اور اس پر چڑھ دوڑا ہو، تو اس کا مضطرب اور پریشان ہونا فطری امر تھا۔ خاص طور پر وادی طائف میں جب لوگ آپ ﷺ پر پتھر برسا رہے تھے اور آپ ﷺ کا خون بہہ رہا تھا، اس وقت آپ ﷺ نے جو دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! تو نے مجھے کہاں چھوڑ دیا ہے، مجھے بے وطن کر دیا ہے اور میرے دشمن کو مجھ پر قابو دے دیا ہے، وہ اسی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ پھر انسان کو خیال بھی آتا ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی کوتاہی یا غلطی سرزد نہ ہوگئی ہو، آخر مجھے کیوں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا؟ یہ سب کچھ کیوں پیش آ رہا ہے؟

اس بات کو جاننے کے لیے ہمیں کسی مخصوص واقعے یا شانِ نزول کو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص بھی حضور ﷺ کی سیرت سے، مکی زندگی کے حالات اور سورۂ ضحیٰ کے نزول کے وقت و حالات سے واقف ہے، وہ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک پیغمبر، داعیِ حق اور مصلح جو اپنی قوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہو، ان حالات میں کس قسم کی ذہنی کیفیت سے دوچار ہوا

ہوگا۔ لوگ کیوں میرا مذاق اڑاتے ہیں؟ میری بات کیوں نہیں سنتے؟ کیوں میرا ساتھ نہیں دیتے؟ اور میرا رب جو میرے ساتھ ہے اور جس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میری نگاہوں میں ہو، تم جہاں بھی ہو، میں تمھارے پاس ہوں، آخر وہ کہاں چلا گیا ہے؟ لوگ میری بات کیوں نہیں مان لیتے ہیں، جب کہ یہ بات صاف، سچّی اور کھری بات ہے؟ لوگ حق بات کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ —— یہ تمام سوالات اسی اضطرابی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس قسم کی کیفیت پر نبی ﷺ کو رہنمائی دی ہے مگر اس موقع پر بہت ہی محبت، شفقت اور تسلی بھرے انداز میں فرمایا گیا ہے کہ نہیں، اے نبی ﷺ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمھارے رب نے نہ تمھیں چھوڑا ہے اور نہ وہ ناراض ہوا ہے۔ وَدَّعَكَ کا مفہوم اردو زبان میں وداع سے ادا ہوتا ہے، یعنی نہ تمھارے رب نے تمھیں وداع کیا یا چھوڑا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔

اس سورہ میں رات اور دن کا تذکرہ کر کے یہ سمجھایا گیا ہے کہ رات اور دن کے آنے جانے پر غور کرو۔ دن کے بعد رات ہو یا روشنی کے بعد تاریکی آ جائے، دن گھٹ جائیں یا راتیں طویل ہو جائیں، یہ تغیّر و تبدل، تبدیلی کی علامت اور اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ روشنی اور تاریکی انسانوں، حیوانوں اور نباتات، سب کی تعمیر و ترقی، نشوونما اور زندگی کے لیے ضروری ہے۔

جس طرح دن اور رات یا روشنی اور تاریکی ایک دوسرے سے مختلف حالتیں ہیں، اسی طرح اگر اقامتِ دین کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں، مخالفتوں اور پریشانیوں کا سامنا ہے تو یہ فطری امر ہے۔ اس راہ میں کہیں سختی ہوگی تو کہیں نرمی، کوئی ایمان لائے گا اور کوئی نہیں لائے گا، کوئی ٹھکرا دے گا، کہیں مایوسی کا سامنا کرنا ہوگا تو کہیں امید کی کرن بھی نظر آئے گی۔

موسموں کے آنے جانے اور دن اور رات کے ہیر پھیر میں، یہی سبق پوشیدہ ہے۔ **عسر**

اوریسر اورتنگی اورآسانی میں بھی یہی سبق پوشیدہ ہے۔ان سب میں اللہ کی حکمت کارفرما ہے۔ پس جورات اوردن اورحالات کے تغیّر وتبدل پرغور کرے گا وہ اس بات کو پا جائے گا کہ حالات سدا یکساں نہیں رہتے۔تبدیلی آ کر رہے گی۔لہٰذا،اے نبی ﷺ ،اگروحی نہیں اتر رہی،دشمن چڑھ دوڑا ہے،مخالفین کے مقابلے میں دوست احباب اورساتھیوں کی تعداد کم ہے،تم اپنے آپ کو بے یارومددگار پاتے ہو،تو یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ تمھاری دعوت سچّی نہیں ہے یا اللہ تم سے ناراض ہوگیا ہے اوراس نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔درحقیقت یہ دعوت کی راہ کے فطری مراحل اورسنگ میل ہیں۔یہ مراحل تمھاری تربیت اوردعوت کے کام کوآگے بڑھانے کے لیے آتے رہیں گے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگوں کی مخالفت سے بات دبتی نہیں بلکہ اورابھر کر سامنے آتی ہے۔مخالفانہ پروپیگنڈا پیغام کوعام کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔نبی کریم ﷺ کو یہ بات سمجھائی گئی اورتسلی دی گئی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ تم سے کوئی قصور ہوگیا یا غلطی سرزد ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اللہ ناراض ہوگیا ہے۔اگرتمھارے ذہن میں ایسی کوئی بات ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔اطمینان رکھو اللہ تمھارے ساتھ ہے۔وہ اپنے وعدے پورے کرکے رہے گا، حق بہرحال غالب آکر رہے گا۔

یہاں لفظ رَبُّكَ استعمال ہوا ہے۔قرآن مجید میں رَبُّكَ کا لفظ مختلف جگہوں پر مخصوص معنوں میں استعمال ہوتا ہے اورآیت کے سیاق وسباق کی نسبت سے معنی کا تعیّن ہوتا ہے۔ یہاں رب کے معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔اگلی آیات میں اس بات کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ اے نبی ﷺ تم یتیم تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمھاری پرورش کی۔تم نادار تھے تو تمھیں غنی کر دیا۔تم راہ حق کی تلاش میں تھے تو تمھیں سیدھی راہ دکھائی۔اس طرح اللہ نے تمھاری جسمانی اورروحانی دونوں طرح سے پرورش کی اورتمھیں اس مقامِ عظیم تک پہنچایا کہ تمھیں اللہ کے پیغام برہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔اس لیے وہ تم سے کیوں ناخوش یا ناراض ہوگا اورتمھارا

ساتھ کیوں چھوڑ دے گا؟ ایسے رحیم و کریم رب اور آقا سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ تم سے اپنے دین کی سربلندی کا کام لے اور تمھیں تنِ تنہا چھوڑ دے!...... یہ پیغام صرف حضور ﷺ کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ان سب لوگوں کے لیے ہے جو دعوتِ دین اور اقامتِ دین کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے اٹھیں۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُولٰى ۝ (۹۳:۴)

اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے آنے والے دور میں کامیابی کی بشارت دیتا ہے۔ یہاں آخرت اور اولیٰ کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آخرت کے معنی بعد میں آنے والی چیز جب کہ اولیٰ کے معنی ہیں پہلی یا شروع میں آنے والی چیز۔ سمجھنے والوں نے اسے دو طرح سمجھا۔ بعض نے کہا کہ اولیٰ کے معنی دنیا اور آخرت کے معنی وہ آخرت جو موت کے بعد پیش آنے والی ہے اور آخرت میں جو اجر، درجات اور انعامات ملنے والے ہیں، وہ اس سے بہت بہتر ہیں جو کہ دنیا میں ملنے والے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں آخرت سے مراد دنیا کی بہتری ہے اور دنیا میں کامیابی کی بشارت دی گئی ہے، یعنی مکہ میں مسلمانوں کو جو ظلم و ستم، جبر و تشدد، استہزا، تمسخر اور تحقیر کا سامنا ہے، بعد میں آنے والا دور اس سے بہت بہتر ہوگا۔ گویا نبی کریم ﷺ کو خوش خبری دی جارہی ہے کہ اسی دنیا میں تم بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ موجودہ حالت بدل جائیں گے، تمھارا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور حق غالب آ کر رہے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم اس آیت کا مفہوم دنیا یا آخرت کے لیے محدود کر دیں کہ یا تو یہ دنیا کے لیے ہے اور یا پھر آخرت کے لیے۔ اس مفہوم میں دنیا

اور آخرت دونوں شامل ہیں۔ آخرت کے لفظ میں دنیا بھی آتی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔

چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ کچھ ہی مدت بعد نبی کریم ﷺ کی زندگی ہی میں آپ ﷺ کا پیغام عام ہوا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اسے قبول کرلیا۔ مکہ جہاں سے آپ ﷺ کو نکالا گیا، وہاں آپ ﷺ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ عرب کی سرزمین جو سمندر کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھی اور تاریخ میں کبھی یکجا نہ ہوئی تھی، وہ ایک مضبوط ملک بن گئی۔ عرب قوم ایک زندہ قوم بن کر اُٹھی۔ لوگوں کے اخلاق واطوار بدل گئے۔ حضور اکرم ﷺ کی صحبت اور تربیت سے اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے وہ اجڈ اور گنوار نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے پیغام اور دعوت کو قبولِ عام بخشا۔ نبی کریم ﷺ کی شخصیت کی محبوبیت کو لوگوں کے دلوں میں قائم کیا اور اتنی بڑی کامیابی سے نوازا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

یہ سب باتیں آخرۃ یعنی بعد کے دور کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اسی طرح روزِ قیامت آپ ﷺ کو جو درجاتِ عالیہ اور مقام فضیلت حاصل ہے جن میں مقامِ محمود اور شفاعت کا اعزاز بھی شامل ہے، وہ بھی آخرۃ کے دائرے میں آتا ہے۔ یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ نے وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰىؕ (اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے) کی صورت میں اپنے نبی ﷺ سے کیا تھا جسے نبی کریم ﷺ کے مشن کی تکمیل اور آخرت میں درجات اولیٰ سے نواز کر پورا کیا گیا۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰىؕ (۹۳:۵)

اور عن قریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔

یہاں اس بات کو مبہم رکھا گیا ہے کہ تمھارا رب تمھیں کتنا دے گا اور کیا دے گا؟ یہ فرمایا گیا

ہے کہ اللہ آپ ﷺ کو اتنا دے گا کہ آپ ﷺ نہال، خوش اور راضی ہو جائیں گے۔ جو آپ ﷺ چاہیں گے، جو آپ ﷺ کی تمنائیں اور آرزوئیں ہیں، آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو وہ سب کا سب عطا کر دے گا۔

یہ اللہ کے وہ وعدے تھے جن کی بنا پر نبی کریم ﷺ اللہ کے پیغام کو عام کرنے اور دعوت کا کام اس یقین اور ایمان کے ساتھ کر رہے تھے کہ حق کا یہ پیغام عام ہو کر رہے گا اور دنیا اس کے آگے جھک کر رہے گی۔ وقتی طور پر حالات کے اثرات سے پریشان ہو کر نبی کریم ﷺ کچھ مضطرب ہو گئے تھے۔ ان حالات میں ان محبت بھرے الفاظ سے نبی کریم ﷺ کو کتنا اطمینان اور تقویت پہنچی ہوگی اور عزمِ مصمم کو ایک نئی تازگی ملی ہوگی، اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ذرا غور کیجیے کہ مکہ کی پوری زندگی میں گنتی کے چند آدمی ایمان لائے تھے جن میں بیشتر غلام تھے۔ ان پر ظلم و ستم روا رکھا جاتا تھا۔ ان کے آقا انھیں مارتے پیٹتے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تپتی ریت پر لٹا کر گھسیٹا جاتا تھا۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جاتا تھا یہاں تک کہ ان کے جسم کی چربی سے انگارے بجھ جاتے تھے۔ ان حالات میں نبی کریم ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک کلمہ تم قبول کر لو، سارا عرب اور عجم تمھارا ہو جائے گا۔ جیسے آج کوئی یہ کہے کہ اگر تم صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کو قبول کر لو تو پاکستان ہی نہیں بلکہ امریکا، روس، انگلستان اور چین سب تمھارے زیرنگیں ہو جائیں گے۔ یہ تھا وہ یقین اور عزمِ مصمم جس کی بنا پر نبی کریم ﷺ دعوت کا کام لے کر چلے تھے۔ یہ صرف اور صرف اللہ کی ذات پر بھروسا اور اپنی دعوت کی صداقت و کامیابی پر یقین کا نتیجہ تھا۔

نبی کریم ﷺ کو اللہ کے وعدے اور اپنی دعوت کی سچّائی اور کامیابی کا کتنا یقین تھا، اس کی ایک عمدہ مثال ہجرت مکہ کے سفر کی ہے۔ دو آدمی اونٹنیوں پر سوار جا رہے ہیں۔ مکہ سے اس

حال میں نکلے ہیں کہ دشمن خون کا پیاسا ہے اور جان لینے پر تلا ہوا ہے۔ آنکھوں میں دھول جھونک کر جان بچا کر نکلے ہیں۔ نہ مکہ میں کوئی جان نثاروں کالشکر ہےاور نہ مدینہ میں، یہ بھی نہیں معلوم کہ مدینہ جا کر کیا ہوگا؟ کیسا استقبال ہوگا؟ کیا حالات ہوں گے؟ یہودیوں کا کیا رویہ ہوگا، آیا آپ کا ساتھ بھی دیں گے یا نہیں؟ دوسرے لوگوں کا کیا معاملہ ہوگا؟ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔

ان حالات میں آپ ﷺ عازم سفر مدینہ ہوتے ہیں۔ایسے میں سراقہ آپ ﷺ کو دیکھ لیتا ہے۔آپ ﷺ کے سر کی قیمت مقرر کی جا چکی تھی۔ وہ انعام کے لالچ میں آپ ﷺ کے تعاقب میں پہنچ جاتا ہے۔مگر حضور ﷺ کے نزدیک پہنچ کر اس کا گھوڑا بدک جاتا ہے اوراس کے پاؤں ریت میں دھنس جاتے ہیں۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ آپ ﷺ کوئی عام انسان نہیں ہیں۔ وہ معافی مانگتا ہےاور درخواست کرتا ہے کہ مجھے پروانہ لکھ دیں۔آپ ﷺ اس کی درخواست پر پروانہ لکھ دیتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ سراقہ میں تمھیں اس دن کی پیشین گوئی کرتا ہوں جس دن کسریٰ کے کنگن تمھارے ہاتھوں میں ہوں گے۔

ذرا تصور کیجیے کہ جان کے لالے پڑے ہوئے ہوں اور ایسے میں کوئی شخص اپنے وقت کی سوپر پاور کے خاتمے کی بات کرے' اور کہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب کسریٰ کے خزانے ہمارے ہاتھ میں ہوں گے اور اس وقت بادشاہ وقت کے کنگن تم پہنو گے، اسے نیم پاگل پن کے سوا اور کیا کہا جا سکے گا۔مگر نبی کریم ﷺ کو اپنے رب کی ذات پر اتنا یقین تھا کہ اس کسمپرسی کے عالم میں بھی آپ ﷺ نے بڑے وثوق سے سراقہ سے کہا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب کسریٰ کے کنگن تمھارے ہاتھوں میں ہوں گے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس کو اپنے رب کی ذات پر یقین ہو کہ آنے والی حالت، موجودہ حالت سے بہتر ہوگی اور اللہ تعالیٰ اتنا دے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے۔

غزوۂ خندق کے موقع پر، مدینہ کی چند ہزار کی آبادی کے مقابلے میں پورا عرب اُمڈ آیا تھا۔۲۴ ہزار کا لشکر خیمہ زن ہو کر مدینہ کو گھیرے بیٹھا تھا۔ ادھر مدینہ میں یہودی اس انتظار میں تھے کہ معاہدہ توڑیں اور مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپیں۔ گویا مسلمان اندرونی اور بیرونی، دونوں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ خندق کھودی جارہی تھی۔ ایسے میں آپ ﷺ کا ایک چھوٹی سی خندق کھودکر اپنی عبادت میں مشغول تھے۔ سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین گدالیں لے کر خندق کی کھدائی میں مصروف تھے۔ چونکہ زمین پتھریلی تھی اس لیے کھدائی کا کام مشکل تھا۔ آپ ﷺ بھی کھدائی میں شریک تھے۔ آپ ﷺ ایک گدال پتھر پر مارتے تھے تو فرماتے تھے کہ مجھے قیصر کے خزانے دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر دوسری گدال مارتے تھے تو کہتے تھے کہ مجھے کسریٰ کے خزانے نظر آرہے ہیں...... یہ اپنی دعوت کی کامیابی پر یقین اور پختہ ایمان کا نتیجہ تھا۔ اس درجہ یقین اور ایمان کہ یہ دعوت جب مدینہ سے نکلے گی تو قیصر و کسریٰ سرنگوں ہو جائیں گے، بڑی بڑی سوپر پاور اس کے آگے ہتھیار ڈال دیں گی، چشم زدن میں یہ دعوت اسپین سے لے کر چین تک پہنچ جائے گی، اس سب کی پیشین گوئی ان دو آیتوں کے اندر موجود تھی۔ حضور ﷺ اس بات سے بہ خوبی واقف تھے۔ آپ ﷺ کو اور بھی اشارے ملتے تھے، خواب اور کلام الٰہی کی صورت میں۔

یہ آیات حضور ﷺ کے ان خدشات کے جواب میں ہیں جن کی وجہ سے آپ ﷺ یہ سوچتے تھے کہ میں بے یارومددگار کیوں ہوں؟ میرے ساتھیوں پر مظالم کیوں ٹوٹ رہے ہیں؟ اللہ کی طرف سے وحی کیوں نہیں آرہی؟ اللہ کا التفات میری طرف کیوں نہیں ہے؟ ان کے علاوہ دیگر وجوہ بھی ان آیات میں سمودی گئی ہیں۔ ان محبت بھرے کلمات نے ان تمام خدشات اور پریشانیوں کو دور کر دیا اور نبی کریم ﷺ کو اطمینان ہو گیا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ ان سب وعدوں کو پورا کرے گا جو اس نے میرے ساتھ کیے ہیں۔

اس سورہ میں اللہ نے جہاں نبی کریم ﷺ کو رات اور دن کے تغیّر و تبدل کی طرح حالات کے بدلنے، وعدوں کو پورا کرنے اور کلمۂ حق کے آگے دنیا کے سرنگوں ہو جانے کا یقین دلایا ہے، وہاں اپنی زندگی پر بھی غور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ ﷺ اپنی زندگی پر ایک نگاہ دوڑائیں کہ کس طرح اللہ نے آپ ﷺ سے حسن سلوک فرمایا؟ کس طرح اس نے آپ ﷺ کی پرورش کی؟ مشکلات اور مسائل میں اس نے کس طرح آپ ﷺ کو سہارا دیا ہے؟ چنانچہ اس سورہ کی آخری تین آیات انھی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔

قرآن نے انسان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے لیے دو معلم، یعنی کائنات اور تاریخ مقرر کیے ہیں۔ کائنات ایک وسیع تصور ہے۔ جس میں رات، دن، سورج، چاند، تارے، زمین، آسمان، بارش، ہوائیں، ان گنت چیزیں شامل ہیں۔ تاریخ بھی ایک وسیع مضمون ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں، ایک حصّہ قوموں کی تاریخ پر مشتمل ہے جب کہ دوسرا حصّہ ہر شخص کی اپنی تاریخ ہے۔ ہر شخص کی عمر اور زندگی ایک تاریخ ہے، جو اس کی نگاہوں کے سامنے ہے، جسے وہ بخوبی جانتا اور پہچانتا ہے۔ میرے اوپر اللہ کے کتنے احسانات ہیں، اس کو مجھ سے زیادہ کون بہتر طور پر جان سکتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دعوت غور و فکر دیتے ہوئے فرمایا:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰىۖ (۹۳:۶)

کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟

یہ بات ایک ایسے ماحول میں کہی جا رہی ہے جہاں آپ بااختیار نہ تھے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ تم یتیم کے حقوق کی ادایگی میں کوئی لحاظ نہیں

کرتے ہو بلکہ یتیم کا مال کھاتے ہو اور پھر اسے جتاتے بھی ہو۔ مال یتیم کو مفت کا مال سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اسے بلا تکلف ہضم کر جایا کرتے تھے اور یتیم کو دھکے دینے اور جتلانے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ اس طرح قرآن نے اس معاشرے کی اخلاقی ابتری کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔

نبی کریم ﷺ اس حال میں دنیا میں تشریف لائے کہ پیدایش سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ ماں بھی چھوٹی عمر میں ہی وفات پا گئیں۔ دادا نے سنبھالا تو پانچ برس کی عمر میں وہ بھی فوت ہو گئے۔ پھر چچا نے پرورش کی ذمہ داری لی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو متوجہ فرمایا کہ ان تمام ادوار میں اللہ کی رحمت کا سایہ اور دست شفقت تمھارے ساتھ رہا اور وہ تمھاری خبر گیری کرتا رہا۔ یہ سب تمھاری نگاہوں میں ہے۔ تم یہ دیکھ چکے ہو کہ تمھارا رب کتنا رحیم اور شفیق ہے کہ جب تم یتیم اور بے یارومددگار تھے تو اس نے تمھارا ہاتھ پکڑا اور تمھاری پرورش کی اور ایک ایسے معاشرے میں تمھاری نگہبانی کی جہاں یتیم کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کیا یہ میری شفقت و مہربانی نہ تھی؟

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰىؕ (۹۳:۷)

اور تمھیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔

ضَآلٌّ کے عربی زبان میں مختلف معنی کیے جاتے ہیں۔ ایک معنی گمراہ ہونے یا بھٹک جانے کے ہیں، یعنی کوئی شخص گمراہ ہو گیا یا بھٹک گیا۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ جن ہستیوں کو اللہ تعالیٰ اپنی نبوت یا رسالت کے لیے منتخب کرنا ہے، منصب نبوت سے قبل اگرچہ وہ شریعت کی پوری تفصیلات نہ بھی جانتے ہوں مگر وہ کھلے شرک یا کفر میں، گمراہیوں یا بداخلاقیوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ چنانچہ ضَآلًّا کے یہ معنی کہ حضور ﷺ گمراہ تھے، اللہ نے راہ دکھادی (نعوذ باللہ)، یہ اس کے معنی نہیں ہیں۔

ضَآلٌّ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ انسان کسی راہ کی تلاش میں ہو کہ کدھر جاؤں اور کیا کروں؟ مثلاً کوئی آدمی تنہا ہو یا اگر ریگستان میں کوئی تنہا درخت ہو تو اس کے لیے بھی ضَآلٌّ کا لفظ آئے گا۔ ایک چیز دوسری میں مل کر ختم ہو جائے، اس کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوگا، مثلاً دودھ پانی میں مل جائے یا پانی دودھ میں مل جائے۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کو شروع ہی سے یہ فکر تھی کہ حق کیا ہے؟ آپ ﷺ راہِ حق کی تلاش میں تھے۔ آپ ﷺ نے بت پرستی یا کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت کبھی نہ کی تھی۔ ایک مرتبہ کسی ناچ گانے کی محفل میں دوست لے گئے تو آپ ﷺ کو نیند آ گئی اور آپ ﷺ پڑ کر سو گئے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اخلاقی گمراہیوں سے حفاظت فرمائی۔ غارِ حرا میں اور تنہائیوں میں، اسی سوچ و بچار اور فکر میں رہتے تھے۔ آپ ﷺ مضطرب اور پریشان تھے کہ کس طرح زندگی بسر کروں کہ میرا رب راضی ہو جائے۔ آپ ﷺ یہ جاننا چاہتے تھے کہ حق کیا ہے اور راہِ ہدایت کون سی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا کہ آپ ﷺ یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ کتاب کے معنی پوری زندگی بھی اور احکام (ہدایت) بھی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو اسلام سے قبل یہ معلوم نہیں تھا کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اخلاقی امور کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے کیا احکامات ہیں اور ایمان سے کیا مراد ہے؟ کن چیزوں پر ایمان لانا چاہیے اور کیسے ایمان لانا چاہیے؟ ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی رہنمائی فرمائی اور سیدھا راستہ کھول کر آپ ﷺ کو دکھا دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ پر احسانِ عظیم تھا۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلاً فَاَغْنٰیؕ (۹۳:۸)

اور تمھیں نادار پایا اور پھر مال دار کر دیا۔

عَائِلاً کے معنی ہیں وہ شخص جس کے پاس کوئی سرمایہ نہ ہو، نادار اور کم مایہ ہو، نیز عیال دار بھی ہو اور غریب بھی۔ عَائِلاً کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ جو روحانی اور اخلاقی طور پر پیاسا ہو اور حق وصداقت کی تلاش میں ہو۔

مفسرین نے اس آیت کے دونوں مفہوم لیے ہیں۔ایک اس معنی میں کہ آپ ﷺ یتیم اور نادار تھے۔جب آپ ﷺ نے تجارت شروع کی تو مال دار ہو گئے۔ پھر آپ ﷺ کی شادی ایک ایسی خاتون سے ہوگئی جو عرب کی امیر ترین خواتین میں سے تھی۔ان کی تجارت کے فروغ میں نبی کریم ﷺ کا نمایاں حصّہ تھا۔یہی وہ بات ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نادار اور غریب تھے، ہم نے تمھیں مال دار اور غنی کر دیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اصل دولت پیسہ یا مال نہیں ہے بلکہ اصل دولت تو دل کی قناعت اور بے نیازی ہے۔ایک آدمی کے پاس اگر ۱۰ لاکھ روپے ہوں اور دل میں یہ آرزو ہو کہ کاش یہ ۲۰ لاکھ ہو جائیں تو وہ غنی نہیں ہے، وہ تو پیسے کا پجاری اور پیسے کا پیاسا اور اپنے آپ کو غریب سمجھتا ہے اور حرص میں مبتلا ہے۔درحقیقت اللہ کو تو دل کی بے نیازی مطلوب ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ اے نبی ﷺ، ہم نے تمھارے دل کو بے نیاز کر دیا۔

ایک مفسر کے الفاظ میں آپ ﷺ کی نظر میں سونا اور پتھر برابر ہو گئے تھے۔یہی وجہ تھی کہ پتھر ہو یا سونا، چٹائی کا بستر ہو یا نرم بستر جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بچھایا تھا، کھانے کے لیے گیہوں یا اچھا کھانا ہو یا دو دن کا فاقہ، آپ ﷺ کو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔آپ ﷺ اپنے رب کی رضا پر راضی رہتے۔اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل کو ان چیزوں سے غنی اور بے نیاز کر دیا تھا۔

اس آیت کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کو حق کی تلاش تھی۔ آپ ﷺ اس کے لیے فکر مند رہتے تھے اور سوچ و بچار کرتے رہتے تھے۔ اس حوالے سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے فضل سے نوازا اور آپ ﷺ کو ہدایت، سچائی اور حق کی راہ دکھائی، اور آپ ﷺ کو مالا مال کر دیا۔ یہ آیت اس مفہوم کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

اللہ نے جو تین وعدے کیے ہیں ان کی مناسبت سے اب مزید تین چیزوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو پہلے تین وعدوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ؕ (۹۳ : ۹)

لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو۔

یعنی اللہ نے تمھیں یتیم پایا تو ٹھکانا دیا' لہٰذا تم بھی کسی یتیم کو مت ستاؤ۔ قھار کے ایک معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے۔ ہر چیز اس کی مطیع و فرماں بردار ہے۔ قھر کے معنی دبانے، حق مارنے، ظلم کرنے اور جھڑکنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اس معاشرے میں یتیم کے ساتھ یہ برتاؤ عام تھا۔ اس لیے کہا کہ یتیم کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرو۔

یتیم کسی بھی معاشرے کا ایک کمزور طبقہ ہوتا ہے لیکن یہاں ایک بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ معاشرے کے اندر جو لوگ کمزور ہوں، جن کے پاس اپنے حقوق حاصل کرنے کی قوت نہ ہو، ان کے حقوق کو غصب نہ کیا جائے بلکہ ان کو سہارا دیا جائے اور ان کے غصب شدہ حقوق دلوائے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاست، معیشت اور دیگر حوالوں سے یتیم کی اصطلاح ایک علامت کے طور پر استعمال ہونے لگی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے۔ لوگوں نے کہا کہ بیت المال سے ان کی تنخواہ مقرر کی جائے۔ سوال پیدا ہوا کہ بیت المال تو مال یتیم کی طرح ہے۔ قرآن نے اس

بارے میں فرمایا ہے کہ جو غنی ہو اور ضرورت مند نہ ہو وہ نہ لے اور جو ضرورت مند ہو وہ اتنی تنخواہ لے جتنی ضروریات زندگی کے لیے ناگزیر ہو۔ خلفاے راشدین کا بیت المال کے حوالے سے یہی رویہ رہا کہ جن کو ضرورت نہیں تھی وہ نہیں لیتے تھے اور جن کو ضرورت ہوتی تھی وہ حسب ضرورت لے لیا کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی تھی اس میں بھی یہی کہا تھا کہ تم میں سے جو کمزور ہے، اور اگر کوئی اس کا حق مارے گا، تو وہ میرے نزدیک قوی ترین آدمی ہے۔ پوری ریاست کی قوت اس کی پشت پر ہوگی یہاں تک کہ میں اس کا حق دلوادوں۔ ظالم خواہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، پوری ریاست کی قوت اس کی گردن پر ہوگی، کمزور کا حق دلوانے کے لیے۔

اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرت و سیاست میں یتیم، یعنی کمزور طبقے کی حمایت کا یہی تصور پایا جاتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کی ادایگی کے لیے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تاکید فرمائی ہے، اس لیے کہ وہ مردوں کے قابو میں ہوتی ہیں۔ اسی طرح غلاموں سے حسنِ سلوک اور ان کے حقوق پر اتنا زور دیا گیا کہ ہمارے ہاں غلام بادشاہ وقت بن گئے۔ برعظیم پاک و ہند میں خاندان غلاماں نے حکمرانی کی ہے۔ یہ انقلابی تبدیلی دراصل اسی ایک ہدایت، یعنی فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْo ''یتیم پر سختی نہ کرو'' کا نتیجہ ہے۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْo (۹۳:۱۰)

اور سائل کو نہ جھڑکو۔

سائل کے دو معنی ہیں، ایک مانگنے والا اور دوسرا پوچھنے والا۔ یہاں دونوں مفہوم مراد ہیں۔ اگر کوئی مانگنے والا ہو تو اس کو بھی نہ جھڑکو اور اگر کوئی دین سے متعلّق کوئی سوال پوچھنے

آ ئے تو اس کو بھی صبر کے ساتھ جواب دو اور اس کو بھی نہ جھڑکو۔ حضور ﷺ نے زندگی بھر ان دونوں پہلوؤں کو اپنے پیشِ نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی سائل آپ ﷺ کے ہاں سے خالی ہاتھ نہیں گیا۔ آپ ﷺ نے کسی کو انکار ’نہیں‘ کیا یا نہیں کا لفظ نہیں کہا۔ کوئی بھی سائل آپ ﷺ کے در پر آیا تو آپ ﷺ نے کچھ نہ کچھ دے کر ہی بھیجا، خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ یہی آپ ﷺ کا وہ وصف ہے جس کی بنا پر شعرا نے آپ ﷺ کی شان میں قصیدے کہے اور نعتیں لکھیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں: ”آپ ﷺ سے زیادہ کوئی سخی نہ تھا“۔

آپ ﷺ دین کے معاملے میں رہنمائی کے لیے آنے والوں کے ساتھ بھی نہایت صبر و تحمل سے پیش آتے تھے۔ دین کے حوالے سے لوگوں کو رہنمائی دینا ایک صبر آزما کام ہے۔ لوگ جہالت سے پیش آتے ہیں، غیر مناسب انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور اس رویے پر آدمی کو غصہ بھی آتا ہے، بسا اوقات دل یہ چاہتا ہے کہ ڈانٹ کر واپس بھیج دیا جائے کہ انھیں بنیادی اخلاقیات تک کا علم نہیں ہے کہ بات کیسے کی جاتی ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے پاس جو لوگ بھی اپنے دکھ درد، مسائل اور پریشانیاں لے کر آتے، آپ ﷺ ان کی بات نہایت تحمل سے سنتے اور نہایت نرمی و شفقت سے پیش آتے۔ کسی کو نہ ڈانٹتے تھے حتیٰ کہ ناروا رویے پر بھی صبر و تحمل اور غیر معمولی ضبط کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ لوگوں کی غلط روش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجرات کے ذریعے نبی کریم ﷺ سے گفتگو کرنے اور آپ ﷺ کی مجلس میں شرکت کے آداب سکھائے۔ آپ ﷺ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ کی عملی تفسیر تھے۔

داعیانِ دین کے لیے نبی کریم ﷺ کا یہ عمل بہترین نمونہ ہے۔ انھیں دین کی اشاعت اور اقامتِ دین کی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے صبر و تحمل اور نرمی و شفقت کے اس رویے کی تقلید کرنا ہوگی۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ○(۹۳:۱۱)

اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔

سورۂ ضحیٰ کے آخر میں نبی کریم ﷺ کو تیسری اور آخری ہدایت اس حوالے سے دی گئی ہے کہ تمھارے رب نے جن نعمتوں سے تمھیں نوازا ہے، ان کا اظہار اور بیان کیا کرو۔ یہاں لفظ اخبر استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ اس کی خبر دے دو بلکہ فَحَدِّثْ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ فَحَدِّثْ کے معنی کسی کام کو بار بار کرنا، کرتے رہنا اور کرنے میں لگے رہنا' کے ہیں۔

نعمت کا مفہوم بھی بڑا وسیع ہے۔ نعمت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ روزمرہ زندگی کے لیے جو کچھ اللہ نے عطا کیا ہے، وہ سب نعمتیں ہیں، مثلاً زندگی ایک نعمت ہے، سانس کا چلنا، دل کا دھڑکنا، ہاتھ پاؤں کا حرکت کرنا، پیٹ بھرنے کے لیے انواع واقسام کے کھانے اور اشیا اور مال و دولت وغیرہ سب مختلف نعمتیں ہیں۔ لہٰذا اظہار نعمت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ انسان کا دل ان نعمتوں کو محسوس کرے اور ان پر شکر گزار ہو۔ زبان سے بھی ذکر اور شکر کرے، مثلاً کھانا کھائے تو کہے الحمدللہ، کپڑا پہنے تو کہے الحمدللہ، سواری پر سوار ہو تو کہے الحمدللہ! گویا جہاں بھی اور جب بھی اللہ کی کسی نعمت سے مستفید ہو تو اظہارِ تشکر کرے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا لفظ اس مفہوم کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی شکر گزار ہو۔ وہ اس طرح کہ اپنا عمل اللہ کے احکامات کے مطابق کرے اور اس کا حق ادا کرے۔ اس طرح سے عملی طور پر شکر گزار بندہ بنے۔

مفسرین قرآن کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ یہاں نعمت کا لفظ ہدایت کی نعمت کے مفہوم میں آیا ہے۔ گویا تمھارے رب نے جو سب سے بڑی نعمت تمھیں دی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ تم یتیم تھے، اس نے تمھاری پرورش کر دی، بے سہارا تھے، سہارا دے دیا، نادار تھے، غنی کر دیا

بلکہ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے تمھیں ہدایت سے تہی دامن پایا اور تمھیں ہدایت بخشی۔اس نے تمھیں روحانی اور اخلاقی علوم اور مادی دولت کے ساتھ ساتھ احکامِ خداوندی، اور قرآن عظیم جیسی نعمت عظمیٰ سے مالا مال کر کے ہدایت دی۔ اب اس نعمت کو دوسرے متلاشیانِ حق تک پہنچانا تمھاری ذمہ داری ہے۔ یہاں 'بیان کرنا' سے مراد ہدایت کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔

یہ تین ہدایات گذشتہ تین نعمتوں کے مقابلے میں دی گئی ہیں۔فرمایا گیا کہ ہم نے تمھیں یتیم پایا تو تمھیں ٹھکانا دیا۔ پس تم بھی کسی یتیم، کمزور اور نادار آدمی کا حق نہ دباؤ، اس کے ساتھ سختی سے پیش نہ آؤ اور اسے مت جھڑکو۔ پھر فرمایا کہ ہم نے تم کو راہِ حق کی تلاش میں پایا اور ہم نے تم کو وہ راہ دکھادی۔ لہٰذا اگر تمھارے پاس بھی کوئی شخص راہ حق کی تلاش میں آجائے تو تم بھی اس کو مت جھڑکو بلکہ اس کے سوال کا جواب صبر وتحمل اور محبت وشفقت کے ساتھ دو اور اس کی رہنمائی کرو۔ آخر میں فرمایا کہ ہم نے تمھیں اپنی ہدایت کی نعمت سے نوازا اور مالا مال کر دیا، سو تم بھی اپنے رب کی اس نعمت پر شکر ادا کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔

میں نے آغاز درس میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ اس پوری سورہ میں بندے اور رب کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے لیکن اس میں ہمارے لیے کیا رہنمائی ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے کلام کر رہا ہے جو ہمیں ماں، باپ، اولاد اور جان و مال سے بڑھ کر محبُوب اور عزیز ہے۔ اللہ کی اپنے رسول ﷺ کے ساتھ یہ محبت بھری گفتگو خود ہمارے لیے بڑی روحانی تسکین اور دل کی زندگی کا سامان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے سپرد کی تھی، وہ مشن، دعوت، حق اور ہدایت پہنچانے کی ذمہ داری، رہتی دنیا تک اب امتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔

اللہ نے امتِ مسلمہ کے لیے بھی سربلندی وسرفرازی کے اسی طرح وعدے فرمائے ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے وعدے کیے تھے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝(آلِ عمرٰن ۳:۱۳۹)

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم مومن ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۪ (النور ۲۴:۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔

گویا اگر تم دنیا میں ایمان اور عملِ صالح کا راستہ اختیار کرو گے تو زمین کی خلافت ہم ضرور تمھیں دیں گے۔ یہ تمام وعدے اللہ نے ہمارے ساتھ بھی کیے ہیں۔لیکن یہ تب ہی ممکن ہے کہ تم کمزوروں کا حق نہ دباؤ، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، مانگنے والوں کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ اور خاص طور پر جو لوگ حق کے متلاشی ہیں، اللہ نے جو نعمت اپنی کتاب کی صورت میں تمھیں دی ہے، اس کو بیان کرو، اسے آگے پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ کرو۔ اپنی زبان اور عمل سے اور ہر طرح سے اس کی تحدیث نعمت کرو۔

یہ مختصر سورہ جو چند آیات پر مشتمل ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے دل موہ لینے والے بول ہیں، صرف ۴۰ الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کی جامعیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ایک چھوٹی سی سورہ میں کتنے اہم مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ ہمارے لیے مقصدِ زندگی، لائحہ عمل، نبی کریم ﷺ سے تعلّق، ان کے مشن کی نوعیت اور اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داری جیسے اہم

مضامین، سب اس میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ یہ سورہ اکثر نماز میں پڑھی جاتی ہے مگر ہم نہیں جانتے کہ اس میں ہمارے لیے کیا پیغام اور ہدایت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

❖❖❖